بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلام ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح محیط ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں انسانیت کو اس سے مکمل ہدایت اور رہنمائی نہ حاصل ہوتی ہو۔ اسلام کے اگر اس امتیازی وصف کو سامنے رکھ کر اس کے مزاج کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اپنے اندر کسی ایسی معمولی آمیزش کو بھی گوارا نہیں کرتا جو اس کے مزاج سے تھوڑی سی مغایرت بھی رکھتی ہو۔ اس کی یہ "غیر مصالحانہ فطرت" اس کی ہمہ گیری کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ دنیا کا کوئی نظام اپنی تعلیمات کے اعتبار سے جتنا ہمہ گیر ہوگا اتنا ہی وہ وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس ہوگا، اور اپنے اندر اُن عناصر کو کبھی برداشت نہ کریگا جو اس کے مزاج سے بنیادی طور پر مطابقت نہ رکھتے ہوں۔

جب تک امتِ مسلمہ کو اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے پر یقین رہا اس وقت تک اُس نے اس کے اندر کسی دوسرے مذہب یا نظام کے اجزا کو شامل کرنا گوارا نہ کیا، بلکہ اس امر کی پوری کوشش کی کہ اس میں باطل کے جو اجزا کسی طرح خلط ملط ہوگئے ہیں انہیں پوری محنت اور دیدہ وری سے چن چن کر الگ کر دیا جائے تاکہ خالص اسلام ہر شعبۂ حیات میں انسانیت کو صحیح صحیح رہنمائی دے سکے۔

مگر اب جبکہ مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کو اسلام کی ہمہ گیری پر یقین کامل نہیں رہا ہے

اور امت کے مغرب زدہ طبقے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تہذیب و تمدن سے نہ صرف مرعوب بلکہ پوری طرح مغلوب ہو چکے ہیں تو اس وقت مسلم قوم کے بعض اطبا اسلامی اور غیر اسلامی اجزاء کو ملا کر ایسے مرکب تیار کر رہے ہیں جو ملت کو صحت مند بنانے کے بجائے اسے جلد ہی مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ اسی قسم کے بےشمار مرکبات میں ایک مشہور مرکب "اسلامی سوشلزم" ہے۔

اس مرکب کے متضاد عناصر کا تجزیہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے اُن مصالح کا جائزہ لیں جن کی وجہ سے اس مرکب کے تیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔

غیب کا علم تو خدا کو ہے، لیکن ہمارے اس ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ اگر اس کے انفرادی تقاضوں سے نہیں تو کم از کم اس کے اجتماعی تقاضوں سے ضرور گلوخلاصی حاصل کرنے کا آرزومند ہے۔ وہ اس مقصد کو ڈنکے کی چوٹ حاصل کرتا لیکن چونکہ قوم ابھی اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی، اور اس بنا پر اس کے اندر قیادت اور سیادت قائم کرنے کے لیے اسلام کی محبت کا دم بھرنا ناگزیر ہے، اس لیے محتاط راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کافرانہ افکار و نظریات اور ملحدانہ تصورات کے ساتھ اسلام کو چپکائے رکھا جائے۔ اسلامی سوشلزم کوئی متعین اسلوبِ حیات نہیں بلکہ اسلام سے فرار اور سوشلزم سے نئی وابستگی کی واضح دلیل ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اسلام کے کئی گوشے تشنۂ تکمیل ہیں جن کی تکمیل کے لیے سوشلزم کو اپنانا ضروری ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت میں اتباع اور پیروی تو سوشلزم کی ہے، اور یہی مقصدِ حیات ہے، لیکن اس میں خاص طور پر وہ پہلو اپنانے کے قابل ہیں جن کی کسی طرح اسلام میں گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

آپ جب کسی مکمل اور اکمل چیز کے ساتھ کسی دوسری شے کا پیوند لگاتے ہیں تو اس کی وجہ

بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کے نزدیک ناقص ہے اس وجہ سے باہر سے مانگ تانگ کر اُسے مکمل کرنے کی فکر دامنگیر رہے۔

یہ وجہ اگرچہ بڑی اہم ہے اور ذہنی مرعوبیت اسی قسم کا غلامانہ طرزِ فکر پیدا کرتی ہے لیکن ہمارے نزدیک اس مرکب کے تیار کرنے کی بڑی وجہ دورِ جدید میں سوشلزم کی انقلاب آفرینی ہے۔ مغرب کا نظریہ "انفرادیت پسندی" (INDIVIDUALISM) جو آج سے دو سو سال پیشتر بڑا انقلاب انگیز تھا، اور جس کے نتیجے میں جمہوریت اور سرمایہ داری پروان چڑھیں، اب اپنی قوت و طاقت قریب قریب کھو بیٹھا ہے اور اس بنا پر اس میں وہ قوت و طاقت باقی نہیں رہی جو کسی قوم کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کر سکے۔ اس نظریہ نے بلاشبہ اپنے عہدِ آغاز میں اسلامی نظامِ حیات کے ساتھ شدید تصادم پیدا کیا، اور امتِ مسلمہ کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن اب جبکہ یہ خود راکھ بن چکا ہے، اسلامی اقدار کے لیے خوفناک حد تک مہلک نہیں بن سکتا۔

اشتراکیت اور اشتمالیت کا معاملہ اس سے بہر حال مختلف ہے۔ یہ نظام "انفرادیت" کو پوری طرح شکست دے کر پوری قوت اور توانائی کے ساتھ دنیا میں اُبھرا ہے۔ اس کی رگوں میں تازہ خون جاری ہے، یہ تسخیر کے بڑے اونچے عزائم رکھتا ہے۔ یہ تمام مخالف نظامہائے حیات کو مٹا کر پوری دنیا پر اپنا تسلط اور برتری قائم کرنے کا عزم بالجزم رکھتا ہے۔ فی الحال اس کے مزاج میں بلا کی طوفان خیزی ہے۔ اور یہ "ہر نقشِ کہن" کو باطل سمجھ کر دنیا سے نیست و نابود کرنا اپنا اولین اور بنیادی فرض سمجھتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس نظام نے جس معاشرے میں بھی اپنے قدم جمائے، اُس معاشرے کے سارے افکار و نظریات تہ و بالا ہو کر رہ گئے۔ وہ اقدارِ حیات جو کبھی اُسے جان سے زیادہ عزیز تھیں، اور جن کی وجہ سے اُسے دنیا میں سربلندی حاصل ہوئی تھی، سب حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئیں۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے فکر و نظر کے زاویے بدلے، خوب و ناخوب کے

پیمانے بدلے، عزت و آبرو کے معیار بدلے، غرض پوری زندگی اپنے سارے مقتضیات کے ساتھ سرتا پا تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اشتراکیت کا یہ انقلاب انگیز مزاج ہر نئے نظام کے مزاج کا خاصہ ہے فلسفۂ تاریخ کے ایک بہت بڑے مفکر نے نظامہائے حیات کے تغیر و تبدل پر بحث کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ جس طرح ایک خندق کو عبور کرتے ہوئے ایک کنارے اور اس کے دوسرے کنارے کے مابین پاؤں جمانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور انسان ایک ہی جست میں یہ سارا فاصلہ طے کرنے پر مجبور ہوتا ہے، بالکل اسی طرح دنیا کا ہر نظام جو اپنی فرمانروائی قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھا ہو وہ اس وقت تک چین نہیں لیتا جب تک ہر مخالف نظام کو مٹا کر اپنا تسلّط پوری طرح قائم نہ کر دے۔ کسی نظامِ حیات میں دوسرے نظاموں کے جو مختلف پیوند لگنے شروع ہوتے ہیں تو یہ مراحل اس وقت آتے ہیں جب اس کے قیام کے بعد اس کے علمبرداروں کی غفلت اور بے پروائی سے اس کی انقلابی روح مردہ پڑ جاتی ہے۔

اشتراکیت اس وقت ایک انقلاب انگیز قوت ہے۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو ایک خاص نہج پر مرتب کرنے کا داعیہ رکھتا ہے۔ مذہب، اخلاق، معیشت، معاشرت، تہذیب، تمدن، ادب، قانون غرضیکہ زندگی کے سارے گوشوں میں یہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مقصد کی کامیابی کا سارا دار و مدار اس بات پر موقوف ہے کہ سب سے پہلے ہر مروجہ قدر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے تاکہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ اور پھر صاف اور ہموار زمین پر اشتراکیت کا رفیع الشان قصر اس کے اپنے دلپسند نقشے کے مطابق تعمیر کیا جائے۔ اگر آپ اشتراکیت کی "کامرانیوں" کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے جس غیر معمولی جبر و تشدد اور جس سرعت کے ساتھ ماضی کے ہر نقش کو مٹایا ہے وہ تاریخ

کی نہ صرف ایک نہایت ہی دلفگار بلکہ عبرتناک داستان ہے۔

آج اشتراکیت کو اپنانے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ہم صرف وسائلِ رزق کو قومی تحویل میں دینا چاہتے ہیں، تاکہ کمزور اور بے بس طبقے ظالم سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد ہوجائیں، بلکہ اسے اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی متاعِ حیات کو ایک بے رحم طوفان کی نذر کرنے کا تہیہ کرچکے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مغرب کے وہ دانشور جو امتِ مسلمہ سے اُس کی سب سے قیمتی متاع، یعنی متاعِ ایمان چھین کر اس کی جگہ الحاد جیسی جنسِ کاسد تھما دینے کا ناپاک عزم رکھتے ہیں، برسوں کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشتراکیت خواہ مغربی ممالک میں کتنا ہی عظیم خطرہ کیوں نہ ہو، مگر مشرقی ممالک کو مغربی تہذیب و تمدن کا پرستار بنانے کے لیے ایک نہایت مفید، موثر اور کارآمد ہتھیار ثابت ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے مذہب اور دین کی ساری اقدار کو باسانی مٹایا جاسکتا ہے۔ ان دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے جن نقوش کو مغربی جمہوریت اور سرمایہ داری برسوں کی محنت اور مال و متاع کے غیر معمولی زیاں کے باوجود مٹانے میں ناکام رہی ہیں انہیں اشتراکیت کا تندو تیز ریلا بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ساتھ بہالے جانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

پھر بعض مسلم ممالک میں اسلامی سوشلزم کا مرکب خاص طور پر اس لیے تیار کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ وہاں کے برسرِ اقتدار طبقوں کی من مانی کارروائیوں کے لیے خاص طور پر مفید اور کارآمد ہے۔ اشتراکیت کا کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ فائدہ تو بہر حال لازمی ہے کہ اس سے ملک کے سارے وسائل برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھ میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اس بنا پر اُسے غیر معمولی قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے اور وہ بلا شرکتِ غیرے ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن جاتا ہے۔

مسلم ممالک میں اسلامی سوشلزم کا جو نعرہ بڑے زور سے بلند کیا جارہا ہے اور اسی کو ان بدنصیب ممالک کے تمام دکھوں کا مداوا بیان کیا جارہا ہے تو اس کی وجہ بجز اس کے کوئی نہیں کہ ان تمام ممالک میں اقتدار کے تخت پر جو حضرات قابض ہیں، چونکہ وہ رائے عامہ کی تائید سے اقتدار

پر مسلط نہیں ہوئے بلکہ مختلف قسم کی سازشوں سے انہوں نے یہ بلند مقام حاصل کیا ہے، اس لیے وہ ایسے سیاسی فلسفوں کے پرچار پر مجبور رہیں جن سے اُن کے قبضائی طرزِ عمل کی تائید ہوتی ہو۔ ان حضرات کی اس وقت بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ کسی ایسے نظریۂ حیات کو مقبول بنائیں جو اُن کے بالجبر حاصل کیے ہوئے اقتدار کے لیے جواز ثابت ہو سکتا ہو، اور پھر ان کے اس اقتدار کی مدت کو زیادہ سے زیادہ لمبا کرنے کے لیے انہیں تمام وسائل پر قبضہ کر لینے میں مدد دے۔

اس مقصد کے لیے سوشلزم سے زیادہ کونسا فلسفہ مفید اور کارآمد ہو سکتا تھا۔ اس سے سب سے پہلے اس امر کا جواز مل جاتا ہے کہ اگر آپ کے پاس قوت و طاقت ہے، تو آپ اجتماعی مفاد کو آڑ بنا کر کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کو جس طرح چاہیں درہم برہم کر کے رکھ دیں۔ پھر یہ اجتماعی مفاد بھی کوئی ایسا نصب العین نہیں جو پورے معاشرے کے دل کی آواز ہو، بلکہ اجتماعی مفاد کا تعین کرنا برسرِ اقتدار طبقے کا اپنا ہی کام ہے۔ وہ جس مفاد کو اجتماعی مفاد کہہ دے وہی اُس پورے معاشرے کا مفاد کہلانے کا مستحق ہے، اور اسی مقصد کے لیے ہر فرد کو بلا سوچے سمجھے تن من دھن قربان کر دینا چاہیے۔ حکمران طبقہ کے مشخص کردہ اجتماعی مفاد کے سوا اور کوئی مفاد اجتماعی نہیں ہو سکتا اور جو شخص بھی اس سے سرِ مُو انحراف کرے یا اس سے معمولی اختلاف کرے وہ ملک و ملت کا انتہائی بدخواہ اور دشمن ہے، اور جو چیز بھی اس کے حصول کی راہ میں حائل ہو اُسے برباد کرنا قوم کا اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ اسی اجتماعی مفاد کے حضور میں مسلمان قوم کو اپنی مقدس روایات تک کے نذرانے پیش کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور اُس سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی ہر قیمتی سے قیمتی چیز کو اس اجتماعی مفاد کی بھینٹ چڑھا دے۔ اس قسم کا آمرانہ طرزِ فکر اور جابرانہ طرزِ عمل کسی ایسے معاشرے میں کس طرح پنپ سکتا ہے جس میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے رائے عامہ کی تائید ضروری ہو اور جس میں قوم کی فلاح و بہبود کا فیصلہ صرف برسرِ اقتدار طبقے کا پیدائشی حق نہ سمجھا جاتا ہو بلکہ اس کے تعین میں عوام کی رائے کو بھی کافی عمل دخل حاصل ہو۔ جس معاشرے میں اقتدار جبر کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو اور جس میں حکمران طبقہ اپنی

کبریائی کے مدت دراز تک ٹھاٹھ جمانے کے ارمان رکھتا ہو اس کے لیے کارگر نسخہ صرف اشتراکیت ہے۔

ان گزارشات کے بعد جن میں ہم نے اُن محرکات کی نشاندھی کی ہے جن کے تحت مسلم ممالک میں "اسلامی سوشلزم" پر خاص طور پر زور دیا جا رہا ہے، اب آپ یہ دیکھیں کہ یہ مرکب اپنے اجزا کی نوعیت کے اعتبار سے کتنا ناقص بلکہ نقصان دہ ہے۔ لیکن اس موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگاہ اس پس منظر پر بھی ڈال لی جائے جس میں سوشلزم نے جنم لیا ہے تاکہ اس کے عناصرِ ترکیبی کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اشتراکیت درحقیقت کوئی ایسا نظامِ حیات نہیں جو مثبت اقدار پر مبنی ہو۔ یہ سراسر منفی تحریک ہے جو مغرب میں انفرادیت پسندی (INDIVIDUALISM) کے غیر متوازن اور حد سے بڑھے ہوئے رجحان کے ردعمل میں پیدا ہوئی۔

دنیا کی ہر انسانی تحریک کی طرح انفرادیت پسندی اور اشتراکیت دونوں تحریکیں سراسر باطل نہیں۔ ان میں بہت سے پہلو حق و صداقت کے بھی تھے۔ لیکن ان دونوں کی انتہا پسندی نے انہیں انسانیت کے لیے مفید بنانے کی بجائے نقصان دہ بنا کر رکھ دیا۔

انفرادیت پسندی کا یہ پہلو بہر حال صحیح ہے کہ کسی معاشرے میں مرکزی مقام فرد ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ فرد وہ بنیادی اکائی ہے جس پر معاشرے کی سر بفلک عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ہدایت و رہنمائی کے مقدس کام کا آغاز بھی فرد ہی سے ہوتا ہے اور اجتماعی بگاڑ کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ اس بنا پر تعمیر و ترقی کا کوئی کام فرد کو بحیثیتِ فرد نظر انداز کر کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا، اور معاشرتی بگاڑ اور اس کے تباہ کن اثرات کا اندازہ افراد ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ پھر اگر اس معاملے کو مذہبی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مذہب نے بھی فرد ہی کو بنیادی اکائی تصور کر کے اس کی اصلاح کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق دیا ہے

اور اسے بحیثیتِ فرد ہی اپنے ہر قول اور فعل کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ جب فرد کو اس دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے تو لامحالہ اجتماعی تگ و دو کا منتہائے مقصود فرد کی بھلائی ہی ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اس بنا پر ہر فرد اپنا یہ جائز حق رکھتا ہے کہ وہ معاشرے سے اپنی آزادی، خود مختاری اور اپنے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا تقاضا کرے۔ مگر دیکھیے کہ فرد کا جو حق اپنے فطری حدود کے اندر رہتے ہوئے بالکل صحیح اور مبنی بر انصاف ہے، وہی جب جائز حدود سے تجاوز کرتا ہے تو معاشرے کے لیے کتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ کسی فرد کا حق اسی صورت میں قابلِ احترام ہے جب اس سے دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوتے ہوں لیکن جب ایک فرد یا چند افراد چالاکی اور عیاری سے، یا اپنی قوت و طاقت سے اپنے حقوق کے دائرے کو اتنا وسیع کر دیں کہ اُن سے دوسروں کے حقوق پر دست درازی ہوتی ہو، اور معاشرہ بحیثیتِ مجموعی نقصان اٹھاتا ہو، تو معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام اور حفظ و بقا بالکل ناممکن ہو جاتا ہے۔

فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کا مسئلہ صنعتی انقلاب سے پہلے کچھ بہت زیادہ پیچیدہ نہ تھا۔ لیکن اس ہمہ گیر انقلاب کے بعد جب وسائلِ رزق پر ایک مختصر سے طبقے کا قبضہ ہونے لگا، اور اس قبضے کی وجہ سے قوت و اقتدار کی باگیں بھی خود بخود اُسی کے ہاتھ میں آگئیں، تو اس وقت اس سوال نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔

انفرادیت پسندی کے علمبرداروں نے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے ہر انفرادی اور اجتماعی فعل میں آزاد اور خود مختار ہیں، اور معاشرے سے جس طرح فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ ریاست یا معاشرے کو اس بات کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اُن کے معاملات میں دخیل ہو۔ معاشرہ اور ریاست افراد کی خداداد صلاحیتوں کو کام کا موقع دینے کے لیے ہیں۔ اُن کا کام افراد کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا نہیں بلکہ اس امر کا التزام کرنا ہے کہ کوئی

دوسرا اُن کی سرگرمیوں میں دخیل نہ ہونے پائے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تگ و دو کو ایک خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہے۔ البتہ جب کوئی اس میں مداخلت کرے تو اُسے پُوری قوت سے دبا دے۔ چنانچہ اس انفرادیت پسندی کے نظام میں ریاست کے فرائض صرف دو کاموں پر مشتمل تھے۔ بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ اور داخلی انتشار سے حفاظت۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں جو نظامِ ریاست، جو نظامِ معیشت اور جو نظامِ معاشرت قائم ہوا وہ سراسر چند چالاک اور مالی اعتبار سے مضبوط افراد کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ افراد جس طرح چاہتے معاشرے کے کمزور اور بے بس لوگوں کو لوٹتے اور حکومت کی سنگینیں ان کی حفاظت کرتیں، عدالتیں ان کے مفادات کی پاسبان اور نگران ہوتیں، ملکی قوانین ان کی ان ظالمانہ کارروائیوں کی تائید کرتے۔ اس طرح ان لوگوں نے نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر عوام میں جیسے چاہا دستِ ظلم دراز کیا اور اُن کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ ڈالا۔ اس ظلم و استبداد سے گھبرا کر اگر عوام میں کوئی تحریک پیدا ہوتی تو حکومت اُسے سختی سے دبا دیتی۔ اگر وہ بیچارے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ جن ایوانوں کو وہ غریبوں اور بے کسوں کی آخری پناہ گاہ خیال کر رہے ہیں وہ صرف امراء کے حقوق کے محافظ ہیں۔ غرض زندگی ان کمزوروں کے لیے پُوری طرح عذاب بن کر رہ گئی تھی۔

اسے محض انسانیت کی بدقسمتی سمجھیے کہ ان اندوہناک حالات میں جب غریبوں کے لیے جینا تک دشوار ہو چکا تھا، مذہب نے بھی کوئی دستگیری نہ کی۔ یہ معاشرہ جس مذہب سے آشنا تھا وہ پادریوں کا مذہب تھا جس میں انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے تو کچھ نہ کچھ تعلیمات موجود تھیں مگر اجتماعی معاملات میں انسان کے لیے کوئی واضح ہدایت اور کوئی جامع پروگرام نہ تھا۔ مذہب کی تاریخ اس حقیقت پر پُوری طرح گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ کمزوروں اور بے بسوں کی پشت پناہی کی ہے اور اس کے اندر ستم رسیدہ مخلوق نے ہمیشہ پناہ لی ہے۔ اس بنا پر بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر یورپ میں مذہب اپنی صحیح اور اصلی شکل میں ہوتا تو وہ اوّل تو